JULY 7, 1983

نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو ۔ کہ قرآن میں آیا ہے لا تقنطوا

EDITOR Sohail Akhtar

THE MESSENGER

FORTNIGHTLY NEWSPAPER

پندرہ روزہ

پیغامبر

اسکاربرو (کینیڈا)

مدیر: سہیل اختر

PERSONNEL
Phone: 416-362-0671

100 CARONIA SQUARE, SCARBOROUGH, ONTARIO. CANADA M1B 2Z8

REPRESENTATIVE:
F. J. Kowalski
Phone: 416-922-6258

آج ہجرت تو ہوئی لیکن وہ نہ بدلا
بھاگ گیا، بھاگ گیا!
کہہ جاتا ہوں تو سب ختم ہو جائے گی!

مالیگاؤں میں پھر مسلم کش فساد، پولیس فائرنگ سے ۳ افراد ہلاک

بھارتی صوبہ مہاراشٹر کے شہر میں لوٹ مار اور توڑ پھوڑ کی وارداتیں

بلوائیوں کا زبردست پتھراؤ، ۲۰۰ پولیس والے بھی زخمی

اب تک ۴۲۵ افراد کو گرفتار کیا جا چکا ہے!

پاکستان کے عوام کمزور یا بزدل نہیں: غفور احمد

انہوں نے سال قبل کے جابر حکمرانوں کو تمام ترطاقت اور قوت استعمال کرنے کے باوجود جھکنے پر مجبور کیا تھا

پنجاب میں بلدیاتی اداروں کی کارکردگی کی جانچ

لاہور کے نزدیک بس اور ویگن میں تصادم، بارہ افراد ہلاک، آٹھ زخمی

ہلاک شدگان میں ایک ہی خاندان کے چار افراد شامل ہیں

ویگن میں سوار خاندان تعزیت کے لئے راولپنڈی جا رہا تھا، بس ڈرائیور گرفتار

دادو میں ۲ ڈاکو گرفتار کر لئے گئے

ڈی آئی جی حیدرآباد رینج

ایک پیسے کا سکہ ختم کر دیا جائے گا

اسمگلنگ کی مختلف کوششیں ناکام بنا کر ۳۴ لاکھ روپے کا سامان ضبط کر لیا گیا

انتقالِ اقتدار کی دستاویزات کی بارہویں جلد کا اجراء

شاہد حامد کے انکشافات

ٹوبہ ٹیک سنگھ میں دو گروہوں کے درمیان تصادم

۲ افراد ہلاک، ۸ شدید زخمی

پی این اے میں حکومت نے

پھوٹ ڈلوائی تھی: پروفیسر غفور

پشاور میں گرمی اور لو لگنے سے ۳ افراد ہلاک

۱۶ بے ہوش ہو گئے

راولپنڈی اور اسلام آباد میں شدید طوفان

۵ افراد ہلاک

مخیر حضرات سے مدد کی اپیل

تھہ حویلی لکھا تحصیل دیپالپور ضلع اوکاڑہ کے بدقسمت محمد شریف ولد محمد دین (سابق لائن مین) گزشتہ بارہ سال سے بستر علالت پر ہیں اور جسمانی طور پر مفلوج ہو چکے ہیں وہ کام کے دوران بجلی کے کھمبے سے گر گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اب وہ صرف دعیات کی کشمکش ہے اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ان کا ذریعہ معاش کوئی نہیں۔ محمد شریف کرب و الم کی زندگی گزار رہے ہیں انہوں نے اپنی دردمندانہ اپیل کے ساتھ بہت سے تصدیق شدہ سرٹیفکیٹ بھیجے ہیں وہ واقعی مصیبت زدہ ضرورت مند شخص ہے انہوں نے دردِ دل اور خوفِ خدا رکھنے والے مخیر حضرات سے اپیل کی ہے کہ وہ ان کی اپنی توفیق کے مطابق کچھ نہ کچھ مدد کریں۔ اللہ تعالیٰ روزِ حشر انہیں اجرِ عظیم دے گا۔ پتہ

محمد شریف ولد محمد دین (سابق لائن مین)
بمقام حویلی لکھا، ڈاکخانہ حویلی لکھا
مکان نمبر ۲۸۵ محلہ بابا بیر اسلام
تحصیل دیپالپور ضلع اوکاڑہ پاکستان

آپ بیتی جگ بیتی

رشوت خور قبر

یہ واقعہ میرے ایک دوست نے سنایا لیجئے انہی کی زبانی سنئے۔ میرے ایک ملنے والے تھے وہ رشوت اور حرام کی کمائی سے چند سالوں میں امیر ہو گئے ایک مکان بنا لیا اپنے والد کو دکان جنرل مرچنٹ کی کھلوا دی اور اپنا کاروبار بھی سیٹ کر لیا ایک دفعہ میں نے ان سے کہا کہ رشوت کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی تو کہنے لگے کہ میری کمائی تو حرام کی ہے لیکن آج تک میں نے اس سے ترقی ہی کی ہے کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا۔ میں نے کہا کہ دیکھو برائی کر کے بھی فخر نہ کرو کچھ عرصہ بعد اس شخص کی طبیعت خراب ہو گئی اس کے پاؤں کی انگلیاں گلنی شروع ہو گئیں اور ناخنوں سے کیڑے منہ نکالنے لگے کاروبار والد کے اکیلے ہونے کی وجہ سے ختم ہونے لگا بیماری کی وجہ سے نوکری بھی چھوٹ گئی آخر اس کا سارا جسم گل گیا اور مکان کے بکنے تک نوبت آ گئی علاج کروایا لیکن جوں جوں دوا کی مرض بڑھتا گیا آخر گلے تک جسم گل گیا اور وہ کہنے لگا کہ مولوی صاحب کو بلاؤ تاکہ میں معافی مانگ لوں میں گیا تو کہنے لگا مولوی صاحب مجھے معاف کر دیں میں نے بہت غلط بات کی تھی۔ میں نے کہا کہ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اللہ تمہیں معاف کرے۔ اسی طرح وہ فوت ہو گیا۔ جسم گلنے کی وجہ سے بدبو آ رہی تھی۔ صحیح طور پر اسے نہلایا بھی نہ جا سکا۔ اور اس کے والد نے مردہ کفنے اور کہنے لگا کہ جا کر اسے دفن کر دو۔ وہ گئے قبر کھودی تو سانپ نکل آئے۔ اسی طرح جو قبر کھودتے اس میں سانپ نکلنے لگتے۔ آخر کار وہ اس کو ایک قبر میں پھینک کر واپس آ گئے۔ اس طرح اس رشوت خور کو اس کے گناہوں کی سزا مل گئی۔ جو باعث عبرت ہے۔

(رشید عظمت زیدی)

ہاتھ کا دیا

دو سال قبل میں اپنی پھوپھی جان کے پاس خانیوال گیا۔ خانیوال میں دو چار دن رہا۔ کیونکہ وہاں مجھے ضروری کام تھا۔ واپس جب میں نے فیصل آباد آنے کے لئے اسٹیشن کی جانب پیدل چلنا شروع کیا تو ایک ضعیف آدمی ایک جگہ چادر پھیلائے بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کی چادر پر تقریباً نو دس روپے پڑے ہوئے تھے جب میں اس کے قریب سے گزرا تو اس نے کہا بیٹا خدا کے نام کا دیتا جا۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔

بزرگ آدمی کی حالت دیکھ کر مجھے بے انتہا ترس آیا اور میں نے جیب میں سے پانچ کا نوٹ نکال کر اس بزرگ آدمی کو دے دیا۔ وہ بزرگ آدمی مجھے دعائیں دینے لگا "اللہ تمہیں خیریت سے رکھے۔ تمہیں ہر مشکلات سے اپنی امان میں رکھے" فقیر کی دعائیں لے کر میں وہاں سے چل دیا اسٹیشن جا کر میں نے ٹکٹ گھر سے فیصل آباد کے لئے ٹکٹ خریدا اور گاڑی میں سیٹ ڈھونڈنے لگا۔ رش تو گاڑی میں کافی تھا۔ لیکن ایک واقف کار مل جانے کی وجہ سے سیٹ مل گئی۔ باتوں باتوں میں جب میں نے کھڑکی سے باہر کی جانب اپنا سر نکالنا چاہا تو اچانک ایک غیبی ہاتھ نے میرے سر کو اندر کی جانب دھکیل دیا۔ یکدم میں حیران ہو کر سوچنے لگا کہ ہاتھ کہاں سے آ گیا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ پٹڑی کے ساتھ ہی ایک کھمبا لگا ہوا تھا جو کہ بالکل گاڑی سے چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ اگر وہ ہاتھ مجھے اندر کی جانب نہ دھکیلتا تو بے خیالی میں میرا سر لازمی طور پر اس کھمبے سے ٹکرا جاتا یہ دیکھ کر اچانک مجھے اس بزرگ کی دعائیں یاد آ گئیں۔

(شاہد محمود چیتا)

میری دوکان

میری دوکان

میری بھی تو ہے

ہم
سب کی دوکان

ہاؤس آف حلال میٹ

HOUSE OF HALAL MEAT

503 DANFORTH AVE.
TORONTO, ONTARIO

PHONE 461-2839

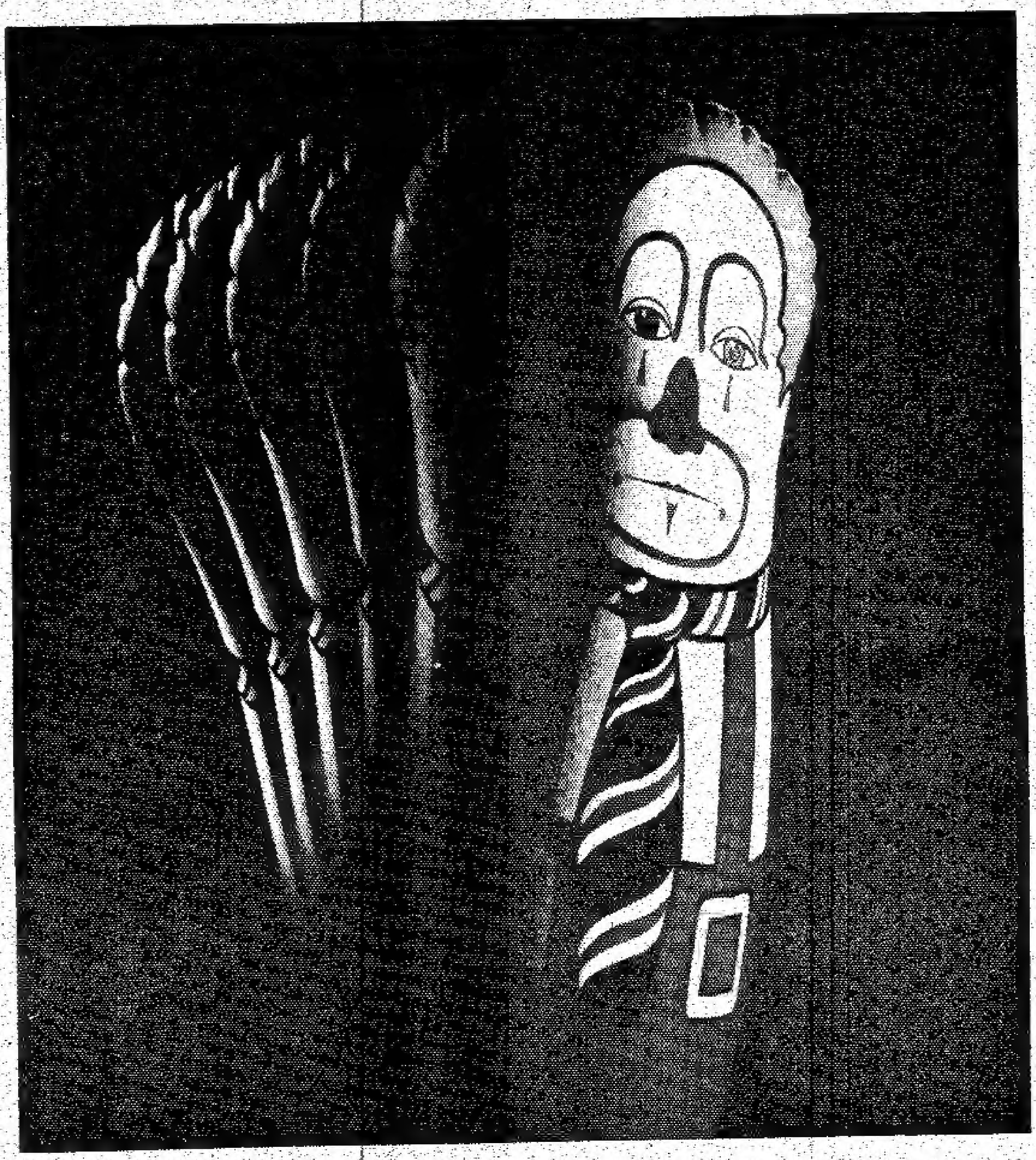

IT IS NOT ALWAYS EASY FOR PEOPLE TO RECOVER.

Rebuilding a life shattered by criminal violence isn't easy. The experience can be long and painful for both victims and their families. In the event of such a personal tragedy the Criminal Injuries Compensation Board is there to help. With financial assistance to lessen the economic and emotional burden of personal physical injury.

Should criminal violence strike, call us. The process of application is simple and informal. The help may be invaluable.

For more information, contact: The Criminal Injuries Compensation Board, 439 University Avenue, 17th Floor, Toronto M5G 1Y8, (416) 965-4755.

THE CRIMINAL INJURIES COMPENSATION BOARD

Ministry of the Attorney General
Ontario
Roy McMurtry, Minister
William Davis, Premier

پیغامبر

THE MESSENGER

جہاں بینی میری فطرت ہے لیکن کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

پبلشر و ایڈیٹر: سہیل اختر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بھارتی رہنماؤں کی بدحواسیاں

گذشتہ کچھ عرصہ سے بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی، وزیر دفاع مسٹر دنکٹش رامن اور ذرائع ابلاغ عامہ نے امریکہ کی جانب سے پاکستان کو ملنے والے جدید اسلحہ پر بڑی شدت سے تشویش اور تنقید کرتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اس طرح اس "خطے" میں اسلحہ کی دوڑ شروع ہو جائے گی پاکستان کو ابھی صرف چھ ایف ۱۶ طیارے ملے ہیں۔ لیکن بھارتی رہنما اسے "اسلحہ کی دوڑ" سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔

بھارت پاکستان سے تقریباً گیارہ گنا بڑا ملک ہے۔ اور وہ "جس سے ملے، جس قدر ملے اور جس قیمت پر ملے" کی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر جدید ترین اسلحہ کے ڈھیر لگا رہا ہے۔ لیکن اسے وہ اسلحہ کی دوڑ تصور نہیں کرتا۔ جب کہ بھارت ایٹمی طاقت بھی ہے۔ اور اسے پاکستان کی نسبت بیرونی خطرات کا بھی زیادہ اندیشہ نہیں۔ اس کے باوجود پاکستان کے جدید ترین اسلحہ کے حصول کے خلاف بھارت کا واویلا مشہور ضرب المثل "اندھا کتا ہوا کو بھونکے" ہی ہو سکتی ہے۔

دفاعی استحکام کے لئے ہر ملک کو اپنی ضروریات کے مطابق اسلحہ خریدنے کا حق ہے۔ اس کا اظہار بھارتی وزیر خارجہ نے دو سال قبل اسلام آباد میں ہونے والے مذاکرات کے اختتام پر بھی کیا تھا۔ اب جب کہ بھارت کے اندر ہر قسم کا اسلحہ تیار ہوتا ہے، پھر بھی بھارت، روس، امریکہ اور دیگر مغربی ممالک سے بہت بڑے پیمانے پر جدید ترین اسلحہ کی خریداری کرتا رہتا ہے۔ ایک اطلاع ہے کہ اب بھارت امریکہ سے ایک ارب ڈالر مالیت کا جدید ترین اسلحہ خریدنے کا آرڈر دے رہا ہے۔ دوسری طرف پاکستان چوبیس پچیس سال پہلے کے ہتھیاروں کو بدلنے کے لئے محدود پیمانے پر جدید اسلحہ خریدنے کا اہتمام کرے تو اندرا گاندھی اسلحہ کی دوڑ کی رٹ لگا کر آسمان سر پر اٹھا لیتی ہیں۔ گذشتہ دنوں انہوں نے یورپی ممالک کے دورے کے دوران کہا تھا کہ پاکستان نے تو افغانستان میں روسی مداخلت سے پہلے ہی اپنے دفاعی اخراجات بڑھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور اب پاکستان کو امریکی اسلحہ ملنے کی وجہ سے برصغیر میں طاقت کا توازن متزلزل ہونے کا اندیشہ ہے۔

بھارتی رہنماؤں سے ہمارا یہی مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ لایعنی اندیشے اور خطرات کا واویلا چھوڑ کر بقائے باہمی کی حکمت عملی اختیار کریں اور اپنے اردگرد چھوٹے چھوٹے ملکوں کو بھی جینے کا حق دے اگر کمزور ملک اپنے دفاعی استحکام کے لئے جدید اسلحہ خریدتے ہیں تو اس سے بھارت کی سلامتی اور بقا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سچی باتیں

(از مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم)

ہر روز صبح سے لے کر رات تک، آپ کی زبان پر جو کچھ آتا رہتا ہو کبھی آپ نے تنہائی میں اس پر بھی غور فرمایا ہے؟ ہر روز جتنی باتیں آپ کی زبان پر آتی رہیں۔ کبھی آپ نے انہیں قلم بند کرکے یہ سوچا ہو کہ کتنی باتیں ان میں جا تھیں اور کتنی بیجا؟ کتنے لفظ زبان ہلانے والے تھے، کتنے نہ تھے؟ کبھی آپ نے اس کا حساب لگایا ہو کہ ہر روز جتنا جتنی گفتگو آپ فرماتے رہتے ہیں اس کا کتنا حصہ محض بحث، فضول اور غیر ضروری ہوتا ہے کتنا حصہ ایسا ہوتا ہے جس سے دوسروں کی دل شکنی اور دل آزاری ہوتی ہے۔ کتنا حصہ جھوٹ، مبالغہ اور نا راستی پر شامل ہوتا ہے کتنے حصے سے دوسروں کی غیبت ہوتی ہے۔ کتنے سے اپنی بڑائی اور خود بینی نکلتی ہے۔ کتنے سے اللہ کے ساتھ بے تعلقی بدگمانی اور بے اعتباری ثابت ہوتی ہے کتنا دوسروں کی خوشامد اور جھوٹی تعریف کے لیے وقف ہوتا ہے۔ اور کتنے حصہ میں محض اپنی بات کی پچ کرنے، نباہنے یا سننے والے کو خوش کرنے کے لیے آپ کو اپنی دیانت، خودداری کا خون کرنے رہنا پڑتا ہے؟ ساری عمر کا اندازہ نہ کیجیے ایک سال، ایک مہینہ، ایک ہفتہ کا بھی حساب جانے دیجئے، صرف ایک شبانہ روز کا ہی حساب کرکے اسے جانچ لیجیے۔

آپ دوسروں کو بے احتیاط، بدزبان، دروغ گو، مفتری، عیب جیں، فتنہ پرداز، سخن چین، قرار دیتے ہیں۔ لیکن خود اپنی گفتگوؤں کو کبھی آپ نے اس پیمانہ سے ناپا ہے۔ جو آپ دوسروں کے لیے ہر وقت ہاتھ میں لیے رہتے ہیں؟ کیا آپ کے خیال میں آپ سمجھے ہیں کہ آپ کی زبان سے جو کچھ نکل جا رہا ہو، یہ کہیں اور حرفاً حرفاً قلمبند نہیں ہوتا جا رہا ہو؟ کیا آپ کے نزدیک آپ کی زبان ہر قسم کی ذمہ داری سے آزاد اور مستثنیٰ ہے؟

کیا آپ کے عقیدہ میں صدق مطلق کا یہ وعدہ کہ انسان کوئی لفظ نہیں بولتا، ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید، مگر یہ کہ اس کے لیے ایک نگہبان تیار رہتا ہو، نعوذ باللہ جھوٹ ہو؟ یا آپ کو یہ اطمینان ہو کہ آپ کی زبان سے جو کچھ نکل رہا ہو کہ ادا کرم اس پر کسی کی گرفت نہیں ہو سکتی؟ اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہو، تو پھر آپ اپنی گفتگو کی طرف سے اس قدر مطلق بے پرواہ اور بے خوف کیوں ہیں؟ کیا قبل اس کے کہ دوسرے کے سامنے حساب دینا پڑے، خود ہی اپنے سے حساب لینا بہتر نہ ہوگا؟

تاریخ اور تذکروں میں آپ پیمبروں، بزرگوں اور خلاف درویشان کے بڑے بڑے مقدس و برگزیدہ رہبروں کے حالات پڑھ چکے ہیں۔ کیا (نعوذ باللہ) ان میں سے کوئی زیادہ گو گزرا ہے؟ کیا وہ بھی دن رات بک بک میں گزارتے تھے؟ خود اپنا تجربہ و مشاہدہ آپ کو کیا بتاتا ہے؟ زیادہ گوئی سے جھگڑے اور فساد بڑھتے ہیں، دلوں کو ملال و فساد پیدا ہوتا ہے۔ اپنے قلب پر غفلتوں کا پردہ اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ آپس کی رنجشیں اور بدگمانیاں بڑھتی ہیں۔ اپنے نامہ اعمال میں جھوٹ، مبالغہ، غیبت، خود بینی، غصہ، سخت کلامی وغیرہ کے عنوانات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یا اس کے برعکس سکون خاطر، اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ روح کو تسلی و تسکین نصیب ہوتی ہے اور اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا ہوتا معلوم ہوتا ہے؟ اگر آج ہم میں سے ہر شخص محض اتنا عزم کرے کہ آئندہ سے اپنی زبان اپنے قابو میں رکھے گا تو ذاتی اور خاندانی، شخصی اور قومی کتنی خرابیوں، کتنی رنجشوں، کتنے فتنوں کا اسی لمحہ اور اسی آن خاتمہ ہو سکتا ہے؟ قولوا قولا سدیدا (بات کہو ٹھیک اور مضبوط) کا فرمان جہاں وارد ہوا ہے، وہیں معاً یہ بشارت بھی دے دی گئی ہے کہ یصلح لکم اعمالکم (تمہارے عملوں کی اصلاح ہو جائے گی تمہارے بگڑے ہوئے کام بن جائیں گے) کاش ایک مرتبہ ہم ہی اس مستند خدائی نسخہ پر عمل کی توفیق ہو جائے!

کرنیں

شوکت محمود

دل کا بندھن تو ٹوٹ جاتا ہے پر ذہن کے شیشے کتنے دائمی ہوتے ہیں۔ کتنے سہانے سال کائنات کے ہزار رنگ بکھرنے کے بعد ان کی ڈوری نہیں ٹوٹتی۔ محبتوں کی تقسیم انسان کو کتنے خانوں میں بانٹ دیتی ہے.... پھر کتنے چہرے تعاقب کرتے ہیں جیسے سائے کے پیچھے بھاگ رہے ہوں.... اور اور.... روشنی سمٹ کر ایک مرکز پر ٹھہر گئی ہو۔ راتوں میں چلنے والے مسافر کیا تم منزل پا لو گے! سورج تمکنی کا سنہری اجالا پھیلا رہا ہے..... کون جانے..... وہ آگے بڑھ رہا ہے۔ چہرے عنوان بن جاتے ہیں۔ پھر نئی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ تم مسکرا یا نہ کرو، مجھے مہربان لگتے ہو! برسوں بعد تو اس جزیرے میں حسن کے بادل سمٹ آتے ہیں۔ سورج مکھی کی کلی سرگوشی کر رہی ہے... کوئی بیل جہاں ٹھہر جاؤں، کوئی بیل جہاں رکا ہوں۔ مجھ سے اپنا بندھن نہ باندھو، تم کومل ہوا، سندر ہو تمہارا سنگھار رہے تو میں بھی آزاد رہوں گا لیکن کون جانے ہمیں کتنا چلنا ہے... کہ سفر ہمارا مقدر ہے.... مسافر کہہ رہا ہے.....!

رفعت علی

اپنی شخصیت کو نکھارنے کے لئے اپنے جانے سے پیار کریں جس کے گھٹنے بڑھنے پر آپ کا اختیار نہیں۔ اس شمع کی تھرتھراتی لو سے پیار کریں جو ہوا کے ایک ہی جھونکے پر دم توڑ دیتی ہے۔ اس اندھیرے سے پیار کریں جو سورج ڈوبتے ہی کائنات پر چھا جاتا ہے اس تنہائی سے پیار کریں جو آپ کو ہمیشہ سوچنے پر اکساتی ہے۔ ان کانٹوں سے پیار کریں جن کی چبھن دیر تک محسوس ہوتی ہے۔ ایسے ہی ہر عمل کو اپنی زندگی کا جزو بنانے والے لوگ قابل احترام ہیں اور وہ لوگ جو تیرگی میں روشنی کی کرن بن جاتے ہیں، پستیوں میں رہ کر بلندیوں کی وسعتوں کو چھو لیتے ہیں اور جو ہر غم کو مسکراہٹوں میں بدل دیتے ہیں۔ اور اللہ کی طرف سے یہ قدرت ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اپنی شخصیت کو سمجھنا چاہتے ہیں اور اس کو نکھارنا چاہتے ہیں۔ کردار کی تعمیر اور فرائض کی بجا آوری کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے ہیں۔ اور ایسے ہی لوگ میرا آئیڈیل ہیں۔

راحیلہ

قبولِ دعا کے لئے مایوسی احساس بیچارگی اور اضطراب ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی بدکرداروں کی دعا بھی قبول ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ کو غمزدہ دل کی بے تابی و مضطرکیفیں جلد ہی مائل بہ کرم دیتی ہیں...!

راشدہ

اس کرۂ ارض پر بسنے والے ہزاروں انسانوں کے ہجوم میں نہ جانے کتنے انسان، کتنے انسانوں کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دیتے رہتے ہیں۔ اگر یہ قربانیاں کسی طور دنیا پر ظاہر ہو جائیں تو یہی قربانیاں اخباروں کی سرخیاں بن جاتی ہیں۔ اور ڈراموں کا عنوان بن جاتی ہیں۔ پڑھنے، دیکھنے اور سننے والے ان پر سر دھنتے ہیں۔ لیکن اگر یہ قربانیاں بدقسمتی سے کسی پر ظاہر نہ ہوں تو ان کی اہمیت نہیں ہوتی وہ صرف ایک آگ کی طرح ہوتی ہیں جو کسی ایک انسان کو جلاتی جاتی ہیں۔ ایسی ہزاروں کہانیاں ہر روز ہر لمحہ اور ہر منٹ جنم لیتی ہیں۔ بس انہیں اخباروں تک پہنچنے کا شرف نہیں ہو پاتا!

معاشرہ اور لوگ — ریاض بٹالوی

بیٹے بیٹیوں نے جائیداد حاصل کرنے کے لئے بوڑھی ماں کو پاگل مشہور کر دیا اور گاڑی میں بٹھا کر ویرانے میں چھوڑ آئے

رات کے تقریباً ۱۱ بجے تھے، کار میں سوار دو نوجوانوں نے دارالامان لاہور کی انتظامیہ سے رابطہ قائم کیا اور بتایا کہ وہ ایک لاوارث اور ضعیف خاتون کو داخل کرانے کے لئے لائے ہیں۔ ادارے کی منتظمہ کے استفسار پر انہوں نے کہا کہ ہم اپنی ورکشاپ بند کر کے گھر جا رہے تھے کہ ضعیفہ سڑک کے کنارے بیٹھی راہگیروں کو پکار رہی تھی۔ اتفاقاً اس کی یادداشت کمزور ہے اور باتیں بھی بہکی بہکی کرتی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ دارالامان نے نوجوانوں کو بتایا کہ ان کے ادارے میں ضعیف اور عمر رسیدہ عورتوں کی رہائش اور دیکھ بھال کا کوئی بندوبست نہیں۔ آپ اسے لاوارث بوڑھوں کے مرکز "عافیت" میں لے جائیں۔ نوجوانوں نے بڑھیا کو عافیت میں لے جانے کے بجائے وہیں سڑک پر بٹھایا اور گاڑی لے کر روانہ ہو گئے۔

اس واقعہ کے تقریباً نصف گھنٹہ بعد اس علاقے کے ایک مکین اور سابق سرکاری افسر جلیل میر صاحب گھر کا بیرونی دروازہ بند کرنے کے لئے باہر نکلے تو انہوں نے ایک بوڑھی خاتون کو گیٹ کے قریب سڑک پہ لیٹے ہوئے دیکھا۔ وہ پریشان ہو کر بڑھیا کی طرف لپکے اور اس سے کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ رونے اور دہائی دینے کے سوا کچھ نہ کہہ سکی۔ بڑھیا کی یہ کیفیت دیکھ کر صاحب خانہ پریشانی کے عالم میں گھر کے اندر گئے اور اپنی بیگم کو سوتے سے جگا کر تمام واقعہ سنایا چنانچہ میاں بیوی اسے گھر کے اندر لے گئے، دودھ پلایا اور بستر تیار کر کے سلا دیا۔

صبح ہوئی تو گھر کی خواتین نے اس اجنبی اور لاوارث بڑھیا کو نہلایا۔ پہننے کے لئے اپنے کپڑے دیئے اور اس سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے اور سڑک پر اسے کون چھوڑ گیا ہے؟ بڑھیا نے بے ربط اور الجھے ہوئے الفاظ میں انہیں اپنا اتہ پتہ بتایا مگر گھر والوں کے پلے کچھ نہ پڑا۔ بہرحال اس کی گفتگو سے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ بڑھیا زخم خوردہ ہے، خون کے رشتوں کی ستائی ہوئی ہے اور زمانے کی بے دردی کا شکار ہے۔ وہ کبھی ایک محلہ کا نام لیتی تھی اور کبھی دوسرے محلے کی نشاندہی کرتی تھی۔ کبھی کبھار اس پر اونچی آواز میں رونے، رونے اور شور کرنے کا دورہ پڑتا تھا اور وہ کبھی کبھی کہہ دیتی میرا جو بیٹا تھا وہ ظالم بن گیا ہے۔ پوتا بے مروت ہو گیا ہے۔ "اچھا جیتے رہیں، خدا انہیں نیک ہدایت دے"

اہل خانہ بڑھیا سے اس کا صحیح اتہ پتہ معلوم کرنے میں ناکام رہے تو جلیل میر صاحب دارالامان کی سپرنٹنڈنٹ مسز دلبر خان سے ملے اور انہیں لاوارث بڑھیا کے بارے میں بتایا اور اخلاقی مدد چاہی۔ مسز خان نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ محکمہ سماجی بہبود کے قائم کردہ لاوارث بوڑھوں کے ادارے عافیت سے رابطہ قائم کریں۔ وہیں پر بڑھیا کو پناہ مل سکتی ہے۔ میر صاحب ذاتی طور پر عافیت کے منتظم سے ملے اور ان سے درخواست کی کہ وہ ضعیفہ کو اپنے ہاں داخل کر لیں۔ مگر عافیت کے انچارج نے یہ کہہ کر انہیں واپس کر دیا کہ ادارے میں لاوارث بوڑھی عورتوں کے رکھنے کا کوئی بندوبست نہیں ہے اور نہ ہی وہ عورتوں کو اپنے ادارے میں داخل کرتے ہیں۔

سماجی اداروں میں ایک لاوارث، بے بس اور لاچار ضعیفہ کو جگہ نہ ملی تو جلیل میر نے [illegible] سے رابطہ قائم کیا اور تمام احوال بیان کرتے ہوئے گلہ کیا کہ کوئی بھی رفاہی ادارہ ان سے تعاون کے لئے تیار نہیں جبکہ وہ چاہتے ہیں کہ نہ صرف بڑھیا کے عزیز و اقارب کا پتہ چل جائے بلکہ اسے کسی محفوظ جگہ مستقل ٹھکانہ بھی مل جائے۔ انہوں نے سوال اٹھایا کہ ایک اسلامی معاشرے میں نادار اور لاوارث بوڑھوں کو پناہ کیوں نہیں مل سکتی؟

ایک معزز اور درد مند شہری کی نشاندہی پر میں نے دارالامان کی سپرنٹنڈنٹ سے درخواست کی کہ وہ کچھ روز کے لئے بڑھیا کو ادارے میں جگہ دے دیں۔ اگرچہ یہ بات عیاں تھی کہ دارالامان میں گھروں سے بھاگ کر آنے والی لڑکیوں، گھریلو جھگڑوں کے مقدمات میں ملوث جوان عورتوں کو رکھا جاتا ہے اور بوڑھی عورتوں کی مناسب دیکھ بھال اور نگہداشت کا کوئی بندوبست نہیں ہے پھر بھی میری نگاہ میں بھی ایک ادارہ تھا جو عورتوں کی سطح پر سماجی بکھروں کو سمیٹ سکے۔ مسز دلبر خان نے اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں انجمن کے سیکرٹری صاحب سے خصوصی اجازت حاصل کر لوں تو وہ بے شک بڑھیا کو داخل کر لیں گی۔ میں نے سیکرٹری صاحب کو فون کیا اور انسانی ہمدردی کی بنیاد پر یہ رعایت مانگی۔ انجمن حمایت اسلام کے سیکرٹری نے معمولی سی رد و کد کے بعد اجازت دے دی اور مجھ سے وعدہ لے لیا کہ میں اخبار کے ذریعے اس کے ورثا کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔

ضعیفہ کی تصویر اور کوائف کے باوجود جب پاکستان کے کسی بھی فرد نے اسے نہ پہچانا اور کوئی بھی شخص اسے ماں، دادی، پھوپھی یا خالہ کہہ کر قبول کرنے پر تیار نہ ہوا تو مجھے بہت حیرت ہوئی۔ ظاہر ہے سڑک پر پڑی ہوئی یہ ضعیفہ نہ تو غیر ملکی تھی اور نہ ہی کسی دوسرے جہان کی مخلوق تھی۔ اس کا رشتہ اسی دھرتی سے تھا اور یہیں کہیں اس کے بیٹے، بیٹیاں، پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں رہتے ہوں گے۔ اگر کوئی اسے پہچاننے سے انکار کر رہا ہے تو کیوں؟ ۔۔۔ آخر کیوں؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے میں دارالامان پہنچا تو سو سال کی عمر والی ایک باوقار ضعیفہ کو صاف ستھرے بستر پر لیٹے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا اور ہاتھوں میں موٹے دانوں کی تسبیح، چہرے مہرے سے کسی اچھے گھرانے کی فرد لگتی تھی۔ میں نے اسے سلام کیا تو وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ کون آیا ہے بیٹی؟ مسز خان نے اسے کہا، "اماں مہمان آئے ہیں۔" "جی آیاں نوں، صدقے واری" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے قریب کھڑی لڑکی سے کہنے لگیں "بھاگ کر جاؤ اور بازار سے ایک ٹھنڈی بوتل لے آؤ" پھر انہوں نے اپنے بستر کی چادر درست کرتے ہوئے کہا "ماں صدقے، یہاں بیٹھو جلدی میرے پاس، کیا تمہیں میرے شفیع نے بھیجا ہے؟"

میں نے پوچھا "اماں شفیع کون ہے؟"

بڑھیا نے محبت سے جواب دیا "لو اور سنو، تم شفیع کو نہیں جانتے، میرا بیٹا ہے نا!" وہ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ میری ایک بیٹی بھی ہے، عائشہ کا بیاہ [illegible] دفعہ سے جرمنی گیا ہوا ہے۔ ایسا گیا ہے پلٹ کے نام بھی نہیں لیتا۔ اس کا بیٹا! چھوڑو بیمار سا ہے، مگر مجھے اس کے گھر سے کیا لینا، جس گھر سے میرا تعلق ہی ختم ہو گیا ہو اور جو بیٹا! بیوی کے کہنے میں آ کر ماں سے آنکھیں پھیر لیتا ہو اسے کیا یاد کرنا؟"

بڑھیا آپ ہی آپ بولے جا رہی تھی۔ "تم ملک تاج الدین کو جانتے ہو۔۔۔ اس کے بیٹوں کو پہچانتے ہو! اس کا ایک بیٹا ٹائروں کا کام کرتا ہے۔ اس کے گھر کے پاس ایک ڈاکٹر کی دکان ہے۔ وہی تو مجھے زبردستی گاڑی میں بٹھا کر یہاں لا کر اور ایک سڑک پر پھینک کر چلا گیا تھا۔

"وہ تمہارا کیا لگتا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"لو اور سنو" بڑھیا نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تاج دین کا بیٹا میرا پوتا ہی تو ہے"

میں نے کہا "اماں جی [illegible]

رفاہی اداروں نے بے سہارا ضعیفہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا

گھر والے اسے رات کی تاریکی میں سنسان سڑک پہ چھوڑ گئے

تمہارے بیٹے اور پوتے؟"

"مجھے کیا، نہ بیٹا کسی کو برا نہیں کہتے۔ سب اچھے ہوتے ہیں، انسان خود ہی برا ہوتا ہے اور برا اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اچھوں سے نباہ نہیں کر سکتا۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور مدہم لہجے میں بولی "میں بڑی ہوں نا، میری قسمت ہی اچھی نہیں ہے بیٹے۔"

عینک کے موٹے موٹے شیشے، چہرے پر بڑھاپے کی جھریاں، سر کے بال روئی کی طرح سفید، قوت سماعت بہت کم، ٹھوڑی پر چند بال اور ہر وقت بولنے اور بڑبڑانے کی عادت ۔۔۔ یہ خاتون دارالامان میں مقیم ہے، نماز وقت کی سختی سے پابندی کرتی ہے اور تہجد پڑھنا کبھی نہیں بھولتی۔ صفائی پسند ہے اور بہت کم کھانا کھاتی ہے۔ سڑک پر پڑی ہوئی ملی تھی تو دو روز تک اناج چکھا تک نہیں تھا۔ ملنسار، مہربان اور مہمان نواز ہے۔ اس کا بس چلتا تو سب کو اپنے اردگرد بٹھا کر کھانا کھلاتی رہے۔

• وہ کون ہے؟

• کس خاندان کی عظمت رفتہ ہے؟

• کس کی ماں ہے؟ کس کی دادی ہے اور کس کی نانی ہے؟

چند روز ہوئے مجھے کسی صاحب نے فون کیا اور اپنا نام ظاہر کئے بغیر کہا کہ "آپ نے جس ضعیفہ کو لاوارث جان کر دارالامان میں داخل کرایا ہے وہ ایک بھرے پرے خاندان کی سربراہ ہے۔ اس کے بیٹے بھی ہیں اور بیٹیاں بھی، وہ [illegible] کی رہنے والی ہے اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس کے گھر والوں نے اسے فالتو اور ناکارہ چیز کی طرح خود سڑک پر پھینکا ہے۔"

دارالامان میں زندگی کی آخری گھڑیاں گننے والی ایک اور خاتون زینب بی بی بھی یونہی داخل ہوئی تھی۔ ادارے کی منتظمہ کے مطابق "کوئی شخص اسے سخت سردی میں سڑک پر پھینک گیا تھا۔ راہگیروں نے اسے دیکھا اور اٹھا کر اندر لے آئے۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس بڑھیا بھوک سے نڈھال تھی اور دکھوں کی سرد مہری نے اس سے بولنے اور سوچنے کی صلاحیتیں چھین لی تھیں۔ صبح ہوئی تو ڈاکٹروں نے دیکھا کہ اس کے جسم پر تشدد کے گہرے زخم ہیں، چنانچہ فوری طور پر ڈاکٹر کو بلایا گیا اور مرہم پٹی کے بعد اسے صاف ستھرا لباس پہنا کر لٹا دیا گیا۔ زینب تب سے لیٹی ہوئی ہے۔ وہ بات چیت کرنے سے معذور ہے نہ کچھ کہتی ہے اور نہ ہی سنتی ہے۔ شاید اس نے اتنا کچھ کہہ لیا ہے اور اتنا کچھ سن لیا ہے کہ اب کچھ کہنا چاہتی ہے اور نہ ہی سننا چاہتی ہے۔ انسان کے صبر کی جب انتہا ہو جائے، زمانے کے ستم جب کمال کو پہنچ جائیں تو حساس آدمی اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہے اور زبان کو دانتوں کے داب لیتا ہے۔

قومی اخبارات میں متعدد بار اس کی تصویریں شائع ہوئیں مگر پون سال کے اس عرصے میں کسی نے نہ تو اسے ماں کہہ کر آواز دی ہے اور نہ ہی نانی دادی کہہ کر پکارا ہے۔ زینب دن بھر آنکھیں موندے لیٹی رہتی ہے۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ ہڑبڑا کر اٹھتی ہے۔ کھوئی کھوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی ہے اور چونک کر پوچھتی ہے "ابھی ابھی کون آیا تھا؟ ابھی ابھی مجھے کس نے آواز دی تھی۔۔۔ شاید میرا بیٹا ہو گا۔ شاید میری بہو ہو گی اور شاید میری بیٹی ہو گی؟"

کچھ عرصے پہلے کا ذکر ہے کہ زینب بی بی کے بارے میں یہ اطلاع ملی تھی کہ اس کا تعلق ایک خوشحال اور متمول گھرانے سے ہے اور چونکہ اس کے جیتے جی بیٹے بیٹیاں جائیداد کے مالک نہیں بن سکتے تھے اس لئے بڑھیا کو راستے سے ہٹانے کے لئے پاگل مشہور کر دیا گیا۔ وہ سودائی تھی نہیں، مگر جب اس نے اپنی اولاد کو لکھا کہ دولت اور جائیداد کی خاطر خدا اور اس کے رسول کے احکامات کو بھلا دیا ہے تو وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی اور ایک روز ایسا ہوا کہ بیٹوں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور ایک ویرانے میں لے جا کر چھوڑ دیا۔ اپنے گناہ پر پردہ ڈالنا بھی ضروری تھا چنانچہ انہوں نے مشہور کر دیا کہ ماں دیوانگی کے عالم میں گھر سے نکل گئی ہے۔

میری معلومات کے مطابق زینب کے بیٹے بیٹیوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کی مظلوم ماں دارالامان میں ہے اور لاوارث، بے سہارا اور لاچار انسانوں کی سی زندگی بسر کر رہی ہے۔ بلاشبہ دولت کی ہوس انسانوں کے خون کو ٹھنڈا کر دیتی ہے اور ادھر ممتا، پیار اور خون کے رشتے کا یہ عالم ہے کہ زینب جب بھی اپنی بے وفا اولاد کو یاد کرتی ہے تو اس کی بوڑھی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔

بات ایک زینب یا ایک بیگم بی بی کی ہوتی تو اسے حادثہ، واقعہ یا اتفاق قرار دیا جا سکتا تھا۔ مگر ہمارے معاشرے میں بزرگوں کا احترام اور والدین کی حرمت کا احساس جس تیزی سے ختم ہو رہا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک روز کسی بوڑھے کی لاش لاوارث قرار دے کر دفن کر دی جاتی ہے اور دوسرے روز کسی ضعیفہ کو ٹھوکروں سے اٹھا کر

لاوارث بوڑھوں اور بوڑھیوں کی تصویریں اخباروں میں شائع ہوتی ہیں مگر لواحقین میں سے کوئی بھی رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کرتا

دیوار کے حوالے میں لٹا دیا جاتا ہے۔ یقیناً ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ لاوارث بوڑھے اور بوڑھیوں کی تصویریں اخبارات میں شائع ہوئیں اور ان کے ورثا میں سے کسی نے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

زیادہ دن نہیں گزرے میو ہسپتال لاہور کے سوشل ویلفیئر آفیسر [illegible] نے فون پر مطلع کیا کہ ہسپتال کے مختلف وارڈوں میں عمر رسیدہ مریض زیر علاج ہیں۔ یہ مریض مختلف شہریوں کے توسط سے داخل ہوئے ہیں، لیکن ان میں سے کسی ایک کے ورثا نے ہسپتال سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ گنگا رام لاہور اور سول ہسپتال کراچی کے دو واقعات تو ایسے ہیں کہ اولاد اور رشتے داروں کی بے حسی پر رونا آتا ہے۔ گنگا رام میں ایک بوڑھے اور ضعیف مریض کو اس کے رشتے دار لائے اور ایمرجنسی میں چھوڑ کر غائب ہو گئے۔ سول ہسپتال میں ایک بوڑھا مریض داخل ہوا۔ چند روز تک اس کے رشتے دار اس مریض کی عیادت کو آتے رہے اور پھر اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر غائب ہو گئے۔

بسا اوقات ٹریفک کے حادثے میں ہلاک ہونے والے بعض عمر رسیدہ شہریوں کی تصویریں اخبار میں شائع ہوتی ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے بہت کم مرنے والوں کے لواحقین پولیس، مردہ خانے یا ہسپتال کی انتظامیہ سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ گویا کہ ان حالات و واقعات کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں بزرگوں اور عمر رسیدہ انسانوں کا احترام ختم ہوتا جا رہا ہے اور انہیں فالتو اور ناکارہ جان کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور یہ رجحان کچھ ایسے ہی کم نہیں ہے کہ مادی زندگی کی اس نفسانفسی میں ہمارے بزرگ ہمارے لئے بوجھ بن گئے ہیں اور ہم خون کے تمام رشتوں کے باوجود اس بوجھ کو اپنے ہاتھوں سے اتار کر راستے میں پھینک دیتے ہیں۔

اور ایک المیہ یہ ہے کہ سرکاری، نجی اور سماجی سطح پر ایسے بہت کم ادارے ہیں جہاں عمر رسیدہ اور ضعیف و نزار بوڑھے رہ سکیں اور زندگی کے آخری سانس سکون سے لے سکیں۔ ایسے ادارے بھی برائے نام ہیں جہاں ان بزرگوں کو پناہ مل سکے جن پر ان کے گھروں کی زمین تنگ کر دی جاتی ہے۔ لاہور اور کراچی میں سرکاری اور جماعتی سطح پر دو ادارے موجود ہیں مگر ایک کے اندر عورتوں کا داخلہ منع ہے اور دوسرے میں مرد داخل نہیں ہو سکتے۔ زمانے کے بگڑتے ہوئے چلن اور حالات کی الٹی رفتار کا تقاضا ہے کہ محکمہ سماجی بہبود ہر بڑے شہر میں اولڈ ہوم بنائے اور مخیر حضرات ان اداروں کی امداد کریں تاکہ لاوارث اور بے سہارا بوڑھے سڑکوں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہ مریں۔

اس ہفتے کا منتخب افسانہ

ستار طاہر

امانت

اُس رات بہت بارش ہوئی خیموں کی اس بستی میں ہر طرف پانی جمع ہو گیا، جہاں پانی جمع نہ ہو سکا، وہاں کیچڑ نے اپنے لئے جگہ بنالی، یہ بے موسم کی بارش تھی، اس نے خیموں کی بستی میں بسنے والے ہر شخص کو متاثر کیا، ہمارے پاس پہلے ہی کیا تھا جو تھوڑا بہت تھا وہ بارش میں بھیگ گیا وہ کہتے ہیں نا کہ غریبی میں آٹا گیلا بس کچھ ایسا ہی ہوا میرے بوڑھے باپ کو کئی دنوں سے شدید بخار تھا رات کی بارش نے اس کی طبیعت مزید خراب کر دی، جب صبح سورج کی گرم لے پانی اور کیچڑ پر اپنی کرنیں بکھیرنے لگا تو میرے باپ کا سانس، دھونکنی کی طرح چلنے لگا، میری بیوی نے کہا: "آپ دیکھ نہیں رہے، ان کی طبیعت کتنی خراب ہے، دوا لایئے، ڈاکٹر کو بلوایئے!"

میں نے فاطمہ کی طرف دیکھا، اس کے عارض کے گلاب مرجھا چکے تھے، ہونٹ جو کبھی خون کی طرح سرخ ہوتے تھے، اب نیلے ہو رہے تھے اس کی آنکھیں جن میں ستارے چمکتے تھے اب ان میں ماکلا اترنے لگی تھی، اس کی ستواں ناک کا بانسا نمایاں ہو گیا تھا، دنیا بدل چکی تھی وہ خود بدل چکی تھی، لیکن کبھی کبھی وہ بھول جاتی تھی کہ ہم اپنے وطن میں نہیں ہم یہاں دوسرے ملک میں فلسطینیوں کے کیمپ میں ہیں، ہم بے وطن ہیں، وہ بھول جاتی کہ ہمارے پاس کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں...

میں نے ایک نظر فاطمہ کو دیکھا، پھر اپنی دس برس کی بیٹی عمیرہ کو...... وہ اپنے دادا کے پاس بیٹھی ان کے منہ سے پانی کا گلاس لگا رہی تھی۔ پانی کچھ منہ کے اندر جا رہا تھا، کچھ باچھوں سے باہر نکل کر بہہ رہا تھا، میرے باپ آخری سفر کے آخری لمحوں میں تھا میں جانتا تھا کہ اب اسے کوئی دوا کوئی معالج نہیں بچا سکتا، لیکن اگر کسی طرح کوئی اسے یہاں سے اٹھا کر وطن لے جائے تو وہ اتنے دکھ اور کرب سے نہ مرتا، بڑے سکون سے جان دیتا، میں اپنے باپ کی طرف بڑھا وہ بدہیئت دری جس پر وہ لیٹا تھا پرانی تھی اس میں سے بو آ رہی تھی، وہ رات کی بارش سے گیلی ہو چکی تھی۔

میں اپنے باپ کے پاس بیٹھ گیا اس نے میری طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی ایک عجیب قسم کی دھندلاہٹ کو میں خود محسوس کر رہا تھا پتہ نہیں یہ میری اپنی آنکھیں دھندلا رہی تھیں یا میں اپنے باپ کی دھندلائی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا، میرے باپ نے بوجھل اور اکھڑتی سانسوں کے ساتھ اپنی ساری توانائی اکٹھی کر کے بولنا شروع کیا، مجھ سے اپنے باپ کی آواز پہچانی نہ جا رہی تھی، اگر وہ خود میرے سامنے بول نہ رہا ہوتا تو میں کبھی یہ آواز سن کر تسلیم نہ کرتا کہ یہ میرے والد کی آواز ہے۔

"تمہاری ماں...... وہیں مرگئی...... اچھا ہوا اچھا ہوا...... لیکن خاک اچھا ہوا...... میں نے سنا ہے...... وہاں وطن میں یہودیوں نے مسلمانوں کے...... قبرستان پر بلڈوزر چلا دیئے ہیں...... اس کی قبر کا نشان بھی مٹ گیا ہو گا...... چلو وہ اس مٹی...... میں تو مل گئی...... میں یہاں خیر...... سنو...... میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا...... ہوں میرے بیٹے......"

میرے مرتے ہوئے باپ نے میرا ہاتھ یوں ٹٹول ٹٹول کر پکڑا، جیسے کوئی اندھا دوسرے کے ہاتھ کو پکڑتا ہے، اس کا ہاتھ سرد تھا فاطمہ میرے باپ کے پیروں میں بیٹھی ہوئی تھی، اس کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں عمیرہ حیرت اور دکھ سے سہتے ہوئے دادا جان کو دیکھ رہی تھی، وہ اپنی زندگی میں پہلی بار کسی کو مرتے ہوئے دیکھ رہی تھی یہ تجربہ اس کے لیے بہت ہولناک تھا خوف اس کے چہرے پر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"میرے بیٹے...... میرے بیٹے" میرا باپ کہہ رہا تھا "میں ایک بات...... کہنا چاہتا ہوں...... آخری بات...... مجھے امانت سمجھ کر دفنانا...... ہاں...... امانت کے طور پر...... جب فلسطین آزاد ہو جائے...... تو اس قبرستان کو ڈھونڈنا...... جہاں تمہاری ماں کو دفن کیا گیا تھا...... اور مجھے اس کے پاس دفنا دینا...... سنو...... سنو...... سن...... و...... اگر تمہاری ماں کی قبر کا نشان نہ ملے تو بھی مجھے میرے گاؤں میں دفنانا...... اور ہاں...... ہاں...... ہم بے گھر ہیں، لیکن ہمیں اپنا وطن واپس لینا ہے...... سنو...... اپنا سر اونچا رکھنا...... تمہارا سر اونچا رہے گا تو فلسطین کا سر اونچا رہے گا...... ہاں...... سر...... اونچا رکھنا......!"

مجھے احساس ہوا میری آنکھیں ہی دھندلا رہی ہیں...... پھر میں نے دیکھا اونچا سر رکھنے کی تلقین کرنے والے میرے باپ کا سر ڈھلک گیا ہے اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے، وہ رخصت ہو چکا تھا، وطن سے دور...... میں نے ایک نظر اپنی بیٹی کو دیکھا...... ایک نظر اپنی بیوی کو اور پھر آنکھیں پونچھتا ہوا خیمے سے باہر نکل آیا وہ باہر کیچڑ تھا، پانی تھا، پھر میں کیمپ انچارج کے پاس پہنچ گیا، اسے اپنے والد کی موت کی خبر دی۔

اس روز شام سے پہلے میرے والد کو کیمپ کے قریبی قبرستان میں دفنا دیا گیا امانت کے طور پر، جنازے میں کیمپ کے لوگ شریک ہوئے، بچے، بوڑھے، جوان سب وطن سے دور تھے، سب وطن جانے کی آس میں بے وطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے، سب کے چہرے لٹکے ہوئے تھے، سب سوگوار تھے، وہ میرے خیمے کے پاس آ کر بہت دیر تک میرے پاس کھڑے رہے ایک تو اتنی جگہ نہ تھی کہ سب کو بٹھایا جاتا اور اگر تھوڑی بہت جگہ تھی بھی تو وہاں خشک زمین کی بجائے پانی اور کیچڑ تھا......!

جب وہ سب چلے گئے تو میری بیوی نے میری طرف دیکھا وہ جو کچھ کہنا چاہتی تھی، وہ میں جانتا تھا، اس کی آنکھوں میں سب کچھ لکھا ہوا تھا لیکن میں اسے سننا نہ چاہتا تھا میں نے خیمے میں داخل ہو کر اپنی بیٹی عمیرہ سے پوچھا "تم نے کچھ کھایا؟" وہ میرے سینے سے لگ کر زار و قطار رونے لگی، میں جانتا ہوں کہ میری بیٹی کم گو ہے، لیکن وہ بہت گہری ہے، وہ بہت حساس اور سمجھنے والی اسے اپنے دادا جان کی موت کا بہت افسوس اور دکھ ہوا تھا، میں خود بھی دکھی تھا لیکن کیا کر سکتا تھا ہم سب کیا کر سکتے تھے؟ اس بے بسی کے باوجود، غریب الوطنی کی المناک موت کے باوجود میرے باپ نے مجھے مرتے ہوئے کہا تھا: "اپنا سر اونچا رکھنا" گویا سر اونچا رکھنا بہت آسان کام تھا، جیسے سر اونچا رکھنے سے ساری مشکلات، تکالیف اور پریشانیاں ختم ہو سکتی تھیں، لیکن سر کیسے اونچا رکھا جا سکتا ہے؟ ہم سب کیمپ میں تھے، نہ ہمارا گھر تھا نہ ہماری زمین، ہمارا کچھ بھی تو نہ تھا، اس غریب الوطنی اور بے بسی کے دنوں میں سر اونچا رکھنے کی تلقین کرنا بھی خوب تھا۔

میری بیٹی کا چہرہ زرد پڑ رہا ہے، رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں، اس کا جسم کمزور پڑتا جا رہا ہے اس نے اپنے دادا جان کی موت کو بہت شدت سے محسوس کیا ہے، ان کا موت سے اس کو بڑا دھچکا لگا ہے اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا، میں نے اس کی آنکھوں میں بہت سے سوال دیکھ لئے تھے اس نے میری آنکھوں میں کیا دیکھا، یہ میں نہیں جانتا میں اپنے آپ کو کانپتا اور لرزتا ہوا محسوس کر رہا تھا، کیونکہ میں جانتا تھا عمیرہ مجھ سے جو سوال پوچھنے والی تھی، میرے پاس ان سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب نہ تھا اور اگر کوئی جواب تھا بھی تو میں ایسے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ "ابو...... دادا جان نے ہمیں کیا کہا تھا؟" میں نے اپنی بیٹی کے نازک اور دبلے پتلے ہاتھ کو دیکھا نیلی رگیں ہاتھ کی جلد کے اندر سے جھانک رہی تھیں "وہ...... وہ کہہ رہے تھے کہ سر اونچا رکھنا"

"ہاں ابو یہ بات میں نے سنی تھی" میری بیٹی نے کہا "مگر ابو، سر کس طرح اونچا رکھا جا سکتا ہے، سر تو ویسے بھی سارے جسم میں اونچا ہوتا ہے" میں سوچنے لگا، میری سوچ الجھی گئی، میں جلد از جلد اپنی بیٹی کے سوال کا جواب دینا چاہتا تھا لیکن میرے لئے سوال کا جواب دینا مشکل ہو رہا تھا، بہرحال

میں نے کہنا شروع کیا: "عمیرہ تم جانتی ہو ہم کون ہیں؟"...... "ہاں ابو، ہم مسلمان ہیں اور فلسطینی" میں نے توصیفی نگاہوں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا، وہ اپنی شناخت جانتی تھی، اپنی پہچان سے واقف تھی، میں نے آہستہ آہستہ بولنے کے ساتھ پوچھا: "عمیرہ تم جانتی ہو کہ ہم ہمارے وطن سے......" "میری بیٹی نے میرا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔ وہ جذباتی اور جوشیلے انداز میں بولی۔ "ابو مجھے سب معلوم ہے کہ ہم سب بے گھر ہیں، یہودی ہماری زمین، ہمارے گھروں اور ہمارے وطن پر قبضہ کر چکے ہیں ابو مجھے یہ بتائیں کہ جب دادا جان نے کہا تھا کہ ہمیشہ اپنا سر اونچا رکھنا، تو اس کا مطلب کیا تھا؟"

میں سوال کا جواب دیتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا جس سوال کا صحیح جواب مجھے پہلے سوجھ نہ رہا تھا، جس سوال کے اظہار کے لئے مجھے الفاظ...... موزوں الفاظ نہ مل رہے تھے، اب میں نے محسوس کیا تھا کہ میں اس مشکل، جان لیوا، اذیت ناک سوال کا جواب دے سکتا ہوں، میں نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا پھر میں نے محسوس کیا کہ میرے لہجے میں آبشاروں کی سی تندی اور پہاڑ پیدا ہو چکا ہے۔

"عمیرہ، میری بیٹی...... ہم دنیا کے ان لوگوں میں سے ہیں جو آزاد ہیں، مگر ان کا وطن غلام ہو چکا ہے ہم غلام نہیں، ہمارا وطن دشمن کے قبضے میں ہے ہم وطن سے دور ہیں بہت دور، لیکن بہت نزدیک ہوا چلتی ہے تو اس میں فلسطین کی مٹی کی خوشبو بسی ہوتی ہے، فلسطین ہمارے دلوں کے قریب ہے مگر آنکھوں سے بہت دور ہم ایک ایسی زندگی گزار رہے ہیں جس کو سمجھنا خود ہمارے لئے بھی مشکل ہو رہا ہے اپنے وطن سے دور، ہم غریب الوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں ہمیں اپنے وطن واپس جانا ہے، اپنا وطن واپس لینا ہے، یہودی درندوں کو اپنے کھیتوں، اپنے گھروں، اپنی زمینوں سے نکالنا ہے لیکن جب تک ہم واپس نہیں جا سکتے، جب تک ہم غریب الوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں، ہمیں ایسا کوئی کام نہیں کرنا جس سے ہمارے وطن کے نام کو بٹہ لگے، ہمیں کسی کے ہاتھ بکنا نہیں ہمیں اپنے نصب العین کو بھلانا نہیں، ہمیں کسی کے آگے جھکنا نہیں، ہمیں کسی سے بھیک نہیں مانگنی ہمیں کسی کے سامنے گڑگڑانا نہیں، ہمیں زندہ رہنا ہے یہ دکھ سہنا ہے، ہر تکلیف خندہ پیشانی سے برداشت کرنی ہے ہمیں دشمنوں سے نمٹنا ہے، اور یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ ہمارا سر اونچا رہے تمہارے دادا نے یہی کہا تھا کہ ہمیشہ سر اونچا رکھنا، فلسطین سے یہودیوں نے سب کو نکال دیا، ہمارے گھروں کو لوٹ لیا ہماری زمینیں ہڑپ کر لیں، تمہاری دادی مر گئی، تمہارے چچا مر گئے، تمہارے ایک ماموں اور بھائی کو قتل کر دیا گیا، تمہارے دادا جان نے بہت دکھ سہے، لیکن انہوں نے اپنا سر ہمیشہ اونچا رکھا، وہ وطن واپس جانا چاہتے تھے، وطن کی یاد اور محبت ان کے روم روم اور ہر ہر سانس میں رچی بسی تھی۔

میں نے اسے کہا: "یہ بات سمجھنا بہت مشکل ہے کہ ہم آزاد ہیں، لیکن وطن غلام ہے ہم آزاد ہیں لیکن غریب الوطن ہیں، ہم اپنے وطن کی امانت ہیں جو وطن سے دور ہو چکی ہے...... ہمیں اپنے آپ کو اپنے وطن کی امانت کو، اپنے وطن کو سونپنا ہے اپنی زندگی، اپنی موت، اپنا ہر چیز کو وطن کی نذر کرنا ہے۔"

میری بیوی سب کچھ سن رہی تھی، میں جانتا ہوں اسے اپنے والدین اپنے بہن بھائی یاد آ رہے تھے، جو مارے گئے تھے، میں اپنی بیٹی سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا، کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہم کیسے زمانے اور کیسے حالات سے گزر رہے ہیں کہ اس عمر میں کہ جب لڑکیاں پریوں اور پھولوں کی کہانیاں پڑھتی اور سنتی ہیں، میں اسے مرنے والوں، غلام وطن اور آزاد بے وطنوں اور امانتوں کی کہانی سنا رہا ہوں...... یہ سب کچھ کتنا ہولناک، کتنا حیران کن اور کتنا ناقابل یقین ہے۔

پچھلی رات بے موسم کی بارش ہوئی تھی اسرائیلی فوجوں نے فلسطینی مہاجرین کے اس کیمپ پر یہودی طیاروں نے گولیوں اور بموں کی بارش کر دی، دھماکوں اور گولیوں کی آواز سے کیمپ میں اٹھا، میری بیوی اور میری بیٹی پہلے سے جاگ رہی تھیں...... میری بیوی کی آنکھوں میں خوف تھا لیکن میری عمیرہ کی آنکھوں میں جوش اور انتقام دکھائی دے رہا تھا، میں اوپر آسمان کی طرف لپکا اور اسی لمحے میرے اور ان کے درمیان دھوئیں اور مٹی کی دیوار کھڑی ہو گئی میرے اندر سے کئی چیخیں نکلیں لیکن ہونٹوں تک نہ آ سکیں، میں سے اندھیرے دھوئیں اور مٹی کے غبار میں انہیں کو ٹٹولا میرے ہاتھ خون سے بھر گئے عمیرہ عمیرہ!...... عمیرہ عمیرہ: میری آنکھوں میں دھواں اور مٹی بھرے ہوئے تھے، تھنوں میں بارود کی بو...... مجھے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا، میں چیخا! عمیرہ عمیرہ! پھر کوئی میرے بازوؤں میں تھا، میرے بازوؤں نے اس کو پہچان لیا وہ میری بیٹی تھی وہ کراہ رہی تھی، گولیاں اور بم برس رہے تھے دھماکے، آوازیں، شور...... عمیرہ عمیرہ...... میں چیخا! ابو...... ابو...... "عمیرہ...... عمیرہ!"

"ابو...... ابو" وہ بولی "ابو......"

"میری بیٹی...... میں سن رہا ہوں...... میں اس پر جھک گیا۔ میرا دل کچھ کہہ رہا تھا مگر میں اپنے دل کی کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ تھا "کہو عمیرہ کہو......"

"ابو...... ابو...... میں بھی وطن کی امانت ہوں جب وطن آزاد ہو تو مجھے وطن لے جانا...... وطن" دھماکوں گولیوں کی بارش میں یہ آواز ڈوب گئی مگر میرے دل میں گونجتی رہی۔

"عمیرہ، عمیرہ!" میں چیخا۔ "فاطمہ، فاطمہ......" مگر نہ میری بیٹی عمیرہ نے میری چیخ و پکار کا جواب دیا نہ میری بیوی فاطمہ نے۔

میں نے ٹٹول ٹٹول کر فاطمہ کو بھی اپنے قریب کر لیا، میں وہاں بیٹھا رہا جانے کب تک...... پھر خاموشی چھا گئی، دھوئیں اور مٹی کا غبار چھٹ گیا میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہو گئیں، وہ دونوں میرے پاس تھیں۔ خون میں لت پت...... مردہ میری آنکھیں دھندلانے لگیں، سر جھکنے لگا۔ اچانک مجھے اپنے باپ کی آواز سنائی دی، "سر اونچا رکھنا۔"

اور میں نے سر کو اونچا کر لیا اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اس نے کہا تھا، میں وطن کی امانت ہوں جب وطن آزاد ہو تو مجھے وطن لے جانا۔

وطن...... وطن کی امانتیں......

یہ میری کہانی ہے میں آپ سے سارے مسلمانوں سے پوچھتا ہوں، میں کب وطن جاؤں گا کب یہ امانتیں وطن کو لوٹاؤں گا مجھے آپ کے جواب کا انتظار ہے۔

نعت

مجھ پہ پھر لطف و کرم ہو شہ والا تیرا
خواب میں پھر نظر آئے رخ زیبا تیرا
تیرا "الطاف" کی لے بی زباں سے کہنا
ہم پہ کتنا بڑا احسان ہے شاہا تیرا
صرف مخلوق ہی قرباں نہیں ہوتی تجھ پر
خود ہے خلاق جہاں والہ و شیدا تیرا
روز محشر وہ گنہ گاروں کے سر پر ہوگا
پیکر نور انہ تھا اس لئے سایہ تیرا
راہزن ہیں جو تری راہ سے بھٹکاتے ہیں
راہبر وہ ہیں دکھاتے ہیں جو رستہ تیرا
ذکر سے مدح کبھی اہل دول کی عابد
نعت گو ہے مرے آقا مرے مولا تیرا

—عابد نظامی

پہاڑ سے گرے ہوئے انسان کے کھڑے ہونے کا امکان ہے لیکن نگاہوں سے گرا ہوا انسان کبھی کھڑا نہیں ہوا۔

انٹرویو

ضمیر نفیس

"قائم مقام صدر، نائب صدر سبھی کچھ ہو سکتا تھا لیکن میں نے ضمیر کی عدالت کا فیصلہ تسلیم کیا اور کرسی چھوڑ دی"

سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ جناب شیخ انوار الحق سے گفتگو

بھٹو کے بارے میں فیصلہ درست، مناسب اور کسی قسم کے دباؤ کے بغیر تھا!

پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب ایس انوار الحق سے ضمیر نفیس کی یہ ملاقات ۱۸ اپریل ۱۹۸۲ء کو ہوئی جب جناب انوار الحق نے عبوری دستور کے تحت حلف نہیں اٹھایا تھا جس کی بنا پر وہ چیف جسٹس آف پاکستان کے عہدے سے الگ ہو گئے تھے۔ یہ انٹرویو بعض وجوہ کی وجہ سے اس وقت شائع نہ ہو سکا تھا۔ مگر مفادِ عام کے لئے ہم اسے اب پیش کر رہے ہیں۔

ہمارے سٹوڈنٹ کی ایک وسیع و عریض کوٹھی۔

شام سوا سات بجے کا وقت!

اداس ماحول، نیم تاریکی، آدھے سے زیادہ بلب آنکھیں بند کئے ہوئے، نہ حرارت نہ روشنی، نہ تمازت۔

یہ کوٹھی ایک طرف گورا قبرستان سے تقریباً ایک سو گز کے فاصلے پر ہے، دوسری طرف یحییٰ خان مرحوم کی رہائش گاہ سے ڈیڑھ سو گز کے قریب۔

اس کوٹھی کی پشت پر فوجی فاؤنڈیشن کا مرکزی دفتر ہے۔ کوٹھی کے گیٹ پر ایک سپاہی جو چاق و چوبند اور چست نہیں بلکہ یوں لگتا ہے جیسے مجبوراً کھڑا کر دیا گیا ہو۔ یہ کوٹھی پاکستان کے سابق چیف جسٹس شیخ انوار الحق کی رہائش گاہ ہے۔

۱۸ اپریل، شام سوا سات بجے کا وقت رہی وقت جناب شیخ سے طے ہوا تھا۔

میں نے فون پر مدعا بیان کیا۔ آنے کی خواہش ظاہر کی۔ کہنے لگے کچھ فائدہ نہیں، میں انٹرویو نہیں دیتا۔ بی بی سی، رائٹر، دوسرے غیر ملکی اخباری نمائندے، میں نے کسی سے کوئی بات چیت نہیں کی۔ اس نرم انکار کے باوجود میرا اصرار بڑھتا رہا۔ ایک دو روز مسلسل فون کرتا رہا۔ آخر کار انہوں نے گفتگو کرنے کی حامی بھر لی۔

گیٹ پر جناب انوار الحق کا ملازم احمد یار پولیس کے سپاہی کے ساتھ کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب ایس انوار الحق میرے سامنے تھے۔ پاکستان کے سابق چیف جسٹس جو قومی تاریخ میں ایک اہم حوالہ ہیں، کسی بھی طرف کا مورخ تاریخ لکھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جناب انوار الحق کو نظر انداز کئے بغیر پاکستان کی تاریخ تکمیل پذیر نہیں ہو سکتی۔

یہ غیر رسمی گفتگو تقریباً سات بج کر بیس منٹ پر شروع ہوئی اور آٹھ بج کر ۳۵ منٹ پر ختم ہوئی۔

آمنے سامنے دو افراد، ایک سپریم کورٹ کے ایوان سے اب عوام کے ایوان میں داخل ہو چکا تھا جبکہ دوسرا اس سفر کی داستان سننے میں محو تھا۔

داستان خاصی طویل تھی۔ دھیرے دھیرے لہجے میں کہانی سننے والا سوال اٹھاتا اور داستان گو جواب دیتا۔

بش شرٹ، پتلون اور چہرہ، ویسا ہی جیسا کہ میں سپریم کورٹ میں عظیم مقدمے کے دوران دیکھا کرتا تھا۔ میں نے پوچھا شیخ صاحب زندگی میں آپ نے بہت سے فیصلے کئے، کبھی پر آپ کو پچھتاوا تو نہیں! کہنے لگے نہیں، میں جب بھی فیصلہ کرتا ہوں سوچ سمجھ کر کرتا ہوں۔ میرے اندر بھی ایک عدالت ہے، ضمیر کی عدالت۔ میں اس کے روبرو پیش ہوتا ہوں پھر فیصلہ کرتا ہوں۔ میں نے کوئی فیصلہ کسی دباؤ، لالچ یا اثر کے تحت نہیں کیا۔ مجھے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کا خوف نہیں ہے۔ میرا وہ فیصلہ جو ایک بہت بڑا فیصلہ تھا قانون کے تقاضوں اور ضمیر کی آواز کے مطابق تھا۔ پچھتاوے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ فیصلہ بھی میں نے درست کیا ہے۔

ساری داستان سننے کی مجھ میں تو تاب تھی لیکن شاید کوئی اور نہ سن سکے۔ اس لئے فی الحال قابلِ سماعت حصے ہی تحریر میں لا رہا ہوں۔

س: آپ کی کوٹھی پر ابھی تک گارڈ ہے یہ کیسے؟

ج: پہلے گارڈ ہٹالی گئی تھی پھر خود ہی ڈی آئی جی نے سپریم کورٹ کے رجسٹرار کو فون کیا اور گارڈ لگا دی۔ گارڈ بھیج رہے ہیں۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گارڈ نہ ہو تو بھی مجھے کوئی خطرہ نہیں، موت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔ گارڈ موت کو نہیں روک سکتا۔ یہ سب فالتو چیزیں ہوتی ہیں۔

سابق وزیر اعظم کی پھانسی کی سزا کے بعد دھمکیاں ملتی تھیں لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ وہ درست اور برحق فیصلہ تھا۔ میں آج بھی کہتا ہوں درست ہے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد ایک بار مجھے جسٹس اکرم ملے، ہنس کر کہنے لگے پیپلز پارٹی والے مجھے کبھی بہت دھمکیاں دیتے ہیں۔ لیکن یقین جانیے میں نے سپریم کورٹ کے فیصلے کو ایک بار پھر پڑھا ہے وہ بہت مناسب اور منصفانہ فیصلہ ہے۔

سوال: قواعد کے مطابق آپ کب ریٹائرڈ ہوتے؟

ج: مئی ۱۹۸۳ء میں مجھے ریٹائرڈ ہونا تھا لیکن اس ملک میں جج کی ریٹائرمنٹ کیا ہے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی اسے کہیں نہ کہیں جانا ہے۔ لیکن مجھے کسی چیز کا لالچ نہیں ہے۔ آخر میں نے اتنی بہت بڑی کوٹھی چھوڑ دی، دو کاریں، نوکر چاکر بڑا فائدہ تھا میں قائم مقام صدر بھی بنتا تھا نائب صدر بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے ضمیر کی عدالت کا فیصلہ تسلیم کیا اور یہ سب کچھ چھوڑ رہا ہوں۔

س: عدلیہ کا مستقبل؟

ج: میں نے ساری زندگی عدلیہ کے وقار کو برقرار رکھنے میں صرف کی۔ پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں تو قومی اسمبلی میں ججوں کو گالیاں تک دی گئیں۔ اس وقت اسپیکر صاحبزادہ فاروق علی تھے۔ بعد ازاں ایک دفعہ وہ ملے، میں نے کہا ٹھیک ہے، آپ وزیر اعظم سے تو ڈرتے تھے لیکن عبدالحفیظ پیرزادہ وغیرہ کو تو خاموش کرا سکتے تھے لیکن نہیں انہوں نے ایسا بھی نہ کیا۔ اس دور میں عدلیہ کی حالت سب کو معلوم ہے۔ لوگ دیکھیں گے میرا یہ فیصلہ بھی درست ہے۔ پاکستان میں عجیب صورت حال ہے۔ دوسرے دن اخبارات میں اپیلیں شائع ہوتی ہیں کہ ہمارے مقدمے کی کارروائی مارشل لاء کے تحت کی جائے جو ستم رسیدہ شخص ہوتا ہے وہ جلد از جلد اور فوری طور پر انصاف چاہتا ہے وہ انتظامیہ سے درخواست کرتا ہے کہ اس کے مقدمے کو ملٹری کورٹ میں لایا جائے جبکہ پہلے وہ سول عدالتوں سے رجوع کرتا ہے، ہائیکورٹ، سپریم کورٹ میں جاتا ہے۔ یہاں ہمیشہ یہی صورت حال رہی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ملٹری بھی سول عدالتوں سے انصاف کی خواہش اور طلب رکھے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ یہ دلچسپ صورت حال ہے، سیاست دان بھی جب اپوزیشن میں جاتے ہیں تو عدلیہ کے وقار کی بات کرتے ہیں، اپیل اور رٹ لے کر ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں آتے ہیں لیکن اگر سیاست دان برسر اقتدار ہوتے ہیں تو عدلیہ انہیں پسند نہیں ہوتی۔ وہ اسے رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

س: محاذ آرائی کی صورت تو نہیں؟

ج: ایسا نہیں ہے۔ میں محاذ آرائی نہیں چاہتا۔ بس جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ فیصلے کرتا ہوں سوچ سمجھ کر کرتا ہوں۔ پچھتاتا نہیں۔ میرا سیاست میں حصہ لینے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اقتدار کی خواہش نہ محاذ آرائی کا منصوبہ۔ بس خاموش اور پر سکون زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔

س: سنا ہے کہ راجہ ظفر الحق آپ کو ملے تھے؟

ج: جی ہاں وہ وکیل بھی ہیں۔ دو روز پیشتر آئے، بیٹھے رہے، گپ شپ ہوتی رہی۔ میں نے کہا تین سال میں ہی جواب دے تھے، سر جھکا کر خاموش رہے، کہنے لگے یہ منسٹری والوں نے ایسا کیا ہے۔

س: نصرت بھٹو کیس میں آپ نے انتخابات کے لئے مناسب وقت کی اصطلاح استعمال کی، اگر مدت کا تعین ہو جاتا تو درست نہیں تھا؟

ج: عدلیہ ایسا نہیں کر سکتی۔ سپریم کورٹ مدت کا تعین کیسے کر سکتی ہے۔ فرض کیجیے سپریم کورٹ مدت کا تعین کر دیتی ہے لیکن اگر اس مدت میں انتظامیہ انتخابات کا انعقاد نہیں کر سکتی تو سپریم کورٹ کیا کر سکتی ہے۔ ہمارا کام فیصلے دینا تھا۔ عملدرآمد تو انتظامیہ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ہم مدت کا تعین کر دیتے تو پھر بھی انتظامیہ کر سکتی تھی۔ گردو پیش کی صورت حال ٹھیک نہیں۔ افغانستان میں گڑبڑ ہے، ایران میں یہ ہے، بلوچستان میں وہ ہے۔ انتظامیہ کی اپنی صورت حال ہے، اپنے راز ہیں۔ ہاں البتہ لاہور ہائیکورٹ میں مناسب وقت کی رٹ ہوئی تھی، فیصلہ ابھی محفوظ ہے۔

س: نظریہ ضرورت کا فیصلہ آپ نے پھر پڑھا؟

ج: کیوں؟ پھر پڑھنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ وہ فیصلہ درست تھا۔ میرے تمام فیصلے درست ہیں۔

س: سیاسی اور قانونی حلقوں کا خیال ہے کہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں اگر صدر کے اختیارات زیادہ ہوتے تو نظریہ ضرورت کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ صدر مداخلت کر کے صورت حال ٹھیک کر دیتا۔

ج: اس وقت وزیر اعظم کے احکامات بے اثر ہو گئے تھے۔ سڑکوں اور گلیوں میں الگ متوازی حکومت چل رہی تھی۔ خون خرابے کے اندیشے۔ لیکن یہ ایک مفروضہ ہے کہ صدر کے اختیارات زیادہ ہوتے تو وزیر اعظم بھٹو کی کارروائیوں کو روکا جا سکتا تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ خلا کو نظریہ ضرورت ہی پر کر سکتا ہے۔ عدلیہ فرد کی آزادی اور اس کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرتی ہے۔ میرا یہ فیصلہ بھی درست ہے۔

تازہ پھل، تازہ سبزیاں، خشک میوہ جات
اور
تازہ مچھلیاں
دالیں، چاول اور انٹرنیشنل گراسری کیلئے اسکاربرو کی صاف ستھری دوکان جہاں قیمتوں میں واضح فرق نظر آئے گا۔ مفت پارکنگ
فون نمبر 261-2297
کیلسن لمیٹڈ
۲۵۰۱ ایگلنٹن ایونیو ایسٹ نزد مڈلینڈ، اسکاربرو
KEALSON LTD.
2501 Eglinton Ave. E., Scarborough

مرحبا ۔ مقدس سرزمین آپکو خوش آمدید کہتی ہے

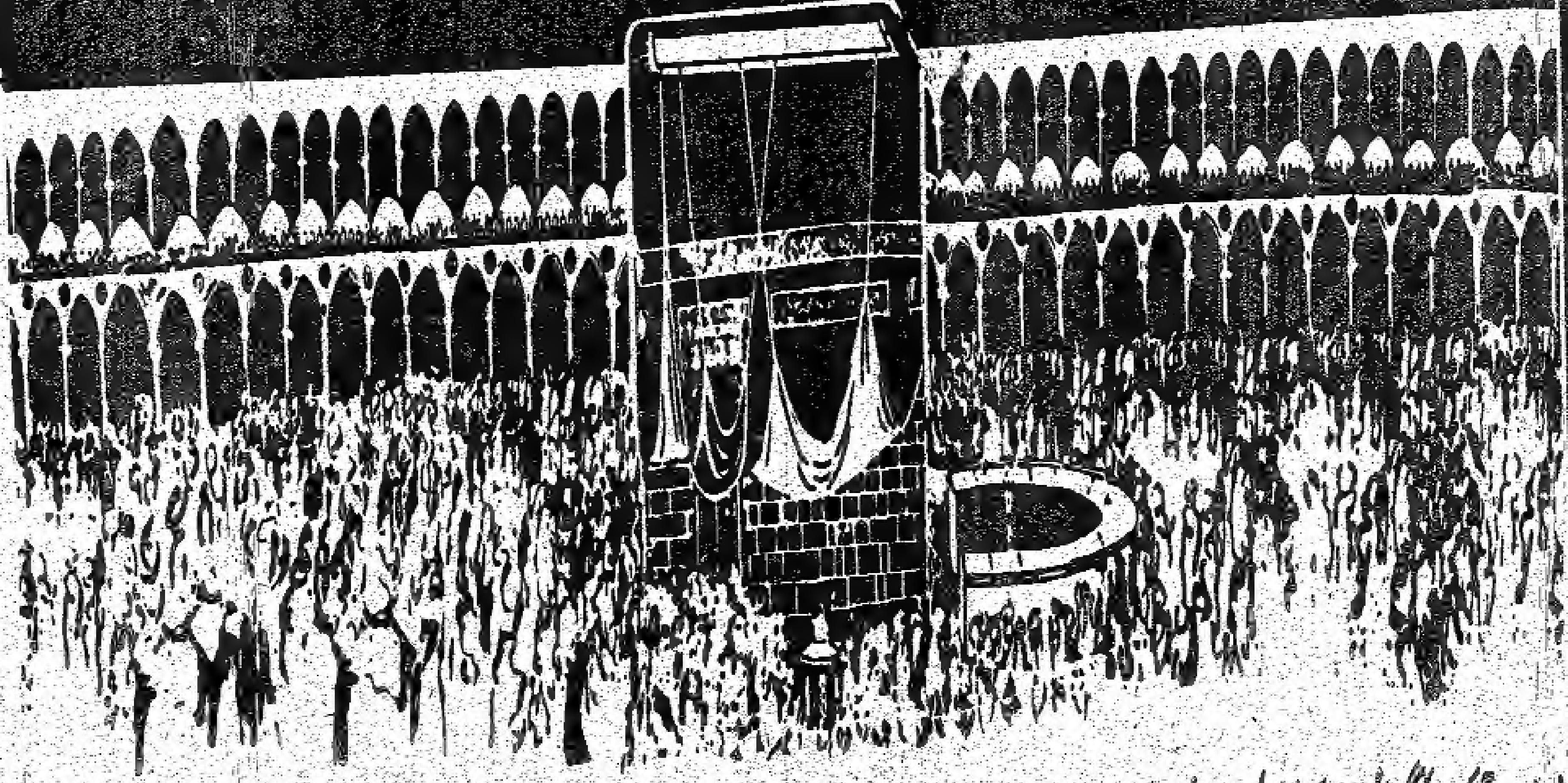

فریضۂ حج کی ادائیگی ہر مسلمان کے لئے جو جسمانی اور مالی اعتبار سے اس مقدس سفر کا اہل ہو، لازمی ہے۔
لیکن حج کا وقت معین ہے۔ عمرہ، چھوٹے حج کی سعادت سال کے باقی عرصے میں حسب خواہش حاصل کی جاسکتی ہے۔ سفر عمرہ کے دوران میں آپ مکۂ معظمہ اور اس کے جوار میں مقاماتِ مقدسہ کی زیارت زیادہ سہولت کے ساتھ بار بار کرسکتے ہیں۔
اور مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی زیارت سکونِ قلب کا سرچشمہ ہے۔
آیئے، ہم آپ کو سفر عمرہ و زیارت کے لئے مقدس ماحول میں جدہ لئے چلتے ہیں۔ جو مکہ معظمہ کی دہلیز ہے اور جدہ سے مدینہ منورہ کی مسافت صرف پچاس منٹ کی پرواز سے طے ہوتی ہے۔

M & J TRAVEL

1240 BAY ST., TORONTO, ONTARIO, CANADA M5R 2A7 TEL. (416) 960-8348 - 960-8475

خواتین اور اوہام پرستی

شوہروں سے ایک سوال

مسلمانوں کے معاشرے میں بیوہ کا کیا مقام ہے۔ جبکہ ایک طرف بیوہ کا احترام اور حقوق ہیں اور دوسری طرف ہم بہت سے جو سلوک روا رکھتے ہیں ان کی ایک الگ نوعیت ہے۔

اسی طرح ہمارے معاشرے میں اور بہت سے غلط نظریات کی بھرمار ہے بہت سے گھرانوں میں دلہنوں پر مختلف قسم کی پابندیاں ہیں مثال کے طور پر بعض گھرانوں میں دلہنوں

خراٹے

اب کوئی مسئلہ نہیں رہا

بھٹو کے بارے میں فیصلہ درست، مناسب اور کسی قسم کے دباؤ کے بغیر تھا!

261-

MANZIL RESTAURANT

Sweets & Snacks

1431 GERRARD ST. EAST, TORONTO

Tel. 466-5824

We only serve HALAL GOSHT

SPECIALISTS FOR:

- BIRYANI
- SEEKH KABAB
- CHICKEN TIKKA
- HALEEM
- KARAHI LAMB
- KARAHI CHICKEN
- SWEETS

CATERING FOR WEDDINGS & PARTIES

VISIT US FOR best quality

INDIAN GROCERIES, FRESH VEGETABLES, NUTS, SPICES ETC.

گروسری، تازہ سبزیاں اور مصالحہ جات

نہایت ہی سستے داموں پر خریدنے کیلئے

ہمارے ہاں تشریف لائیں

Pirri's Dixieland Market Limited

FRESH FRUITS — VEGETABLES — FLOWERS

RETAIL: 1106 PHARMACY AVE.

PHOE: 759-0473

WHOLESALE: 1052 BRICHMOUNT RD.

PHONE: 759-5214

SCARBOROUGH.

مکتوب کراچی

آصف اقبال نے ماں بہنوں کو کیوں قتل کیا؟

اخلاقی اعتبار سے ہم کہاں کھڑے ہیں؟

محمد ارشاد الحق

پچھلے دنوں کراچی کے علاقہ گلشن اقبال میں تہرے قتل کی ایک انتہائی لرزہ خیز واردات ہوئی۔ اس واردات نے پورے ملک کو سراسیمہ کرکے رکھ دیا ہے۔ یوں تو ہمارے ملک میں ہر روز قتل کی وارداتیں ہوتی ہیں اور ان کی خبریں بھی چھپتی ہیں۔ لیکن جس خبر کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ اپنی نوعیت کی انتہائی المناک خبر ہے۔ یہ ایسی خبر ہے جو رونگٹے بھی کھڑے کر دیتی ہے اور ہمارے معاشرے کے ضمیر کو بھی جھنجوڑتی ہے کہ ہم کیا ہیں، کیا کر رہے ہیں اور اخلاقی اعتبار سے ہم کہاں کھڑے ہیں۔

گلشن اقبال کے ایک نوجوان آصف علی نے جو انجینئرنگ کا طالب علم تھا نے اپنی سگی ماں اور دو بہنوں کو چھری سے ذبح کر دیا۔ اس روح فرسا واقعہ کے پس منظر میں کیا ہے؟ ملزم آصف علی اس قدر سفاک کیوں بن گیا کہ اس نے اپنی ماں جس کی کوکھ سے اس نے جنم لیا تھا اسے ذبح کر دیا۔ اس سوال کا جواب تو پولیس کی تفتیش کے بعد ہی واضح طور پر سامنے آ سکے گا۔ لیکن آصف علی نے قتل کے بعد پولیس سے جو باتیں کی ہیں وہ بڑی غور طلب ہیں۔ اس نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں کے قتل پر قطعاً پشیمان نہیں۔ اس نے کہا کہ وہ واردات کے بعد ایک سکون محسوس کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی ماں اور دو بہنوں کو قتل کرنے کے لیے باورچی خانہ کی چھری چند روز پہلے سے تیز کر رہا تھا تاکہ جب وہ ماں اور بہنوں کے گلے پر چھری پھیرے تو انہیں تکلیف نہ ہو۔ اپنی ماں خورشید بانو اور بہنوں گلناز اور فرح ناز کو موت کی نیند سلانے کے بعد ملزم آصف علی سکون سے پولیس کو بیان دیتا رہا۔

آصف علی نے پولیس تفتیش کے دوران جو دوسری دلچسپ باتیں بتائیں اور ان کی تفصیلات جہاں قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں گی وہاں انہیں معاشرے میں ہونے والے جرائم کے محرکات کو سمجھنے میں مدد دیں گی۔

ملزم آصف علی نے تحقیقات کے دوران پولیس کے سامنے انکشاف کیا ہے کہ میرے باپ محمد عبداللہ نے مجھے جائیداد وغیرہ سے عاق کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں میرے باپ نے اخبار میں اشتہار بھی شائع کرایا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میرے باپ نے میرے بھائی جاوید کو بھی اسی طور پر عاق کر دیا تھا کہ اس نے ماں باپ کی مرضی کے بغیر شادی کر لی تھی۔ ملزم نے یہ بھی بتایا کہ اس کی ماں مقتولہ خورشید بیگم کی پہلی شادی مراد آباد میں ہوئی تھی۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ میری ماں نے اپنے پہلے شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے بعد میرے باپ سے شادی کی تھی لیکن اس کے ایک رشتہ دار نے پولیس کو بتایا ہے کہ اس کی ماں نے پہلے شوہر کے انتقال کے بعد دوسری شادی اب سے ۳۰ سال قبل محمد عبداللہ سے کی تھی اور ملزم اور اس ذریعہ کے مطابق ملزم کی مقتولہ بہنیں اور دوسری بہنیں موجودہ باپ کی ہی اولاد ہیں۔ ملزم آصف نے بتایا کہ اس کی شادی دو ماہ قبل اس کی ماموں زاد بہن سے طے ہوئی تھی

> **آصف اقبال اپنی ماں اور بہنوں کو قتل کرکے اپنے ضمیر سے مطمئن تھا**

لیکن اس نے اپنی بہنوں اور بھائی کی شادی ننھیال کے لڑکے اور لڑکیوں سے کرنے کی شرط رکھی تھی لیکن یہ شرط منظور نہیں کی گئی جس کی وجہ سے میں نے یہ رشتہ ختم کر دیا لیکن اس کے ایک رشتہ دار نے پولیس کو بتایا کہ ملزم کے کردار کی وجہ سے اس کا رشتہ منسوخ کر دیا گیا تھا۔ ملزم نے پولیس کو یہ بھی بتایا کہ اس نے مارچ ۱۹۸۶ء میں اپنی تعلیم ترک کر دی تھی۔ اس لیے اس کے باپ نے اس کے کہنے پر اسے ریوالور نہیں دلایا۔ پھر اس نے اپنے باپ سے کسی طور پر ۲۰ ہزار روپے حاصل کیے اور کراچی آ گیا۔ اس نے باپ سے یہ رقم یہ کہہ کر مانگی تھی کہ وہ کسی دوسرے ملک ملازمت کے لیے جائے گا لیکن اس نے یہ رقم کراچی آ کر ڈیڑھ ماہ میں ختم کر دی۔ ملزم آصف کا کہنا ہے کہ اسے یہ بات بہت بری لگتی تھی کہ میرے ماموں کی غربت کی وجہ سے میری ماں اور بہنیں میرے ماموں کے گھر آ کر نہیں ٹھہرتی تھیں بلکہ وہ اپنے ایک امیر اور باحیثیت رشتہ دار کے گھر ٹھہرتی تھیں۔ جہاں اکثر کشیدہ [illegible] ملزم نے یہ بھی بتایا کہ لاہور میں تعلیم کے دوران میری ایک بہن کے کالج کے ایک لڑکے سے تعلقات ہو گئے تھے اور وہ مجھے اکثر طعنہ دیتا تھا۔ اس لڑکے کو قتل کر دیا گیا تھا۔ ملزم نے کہا کہ اس کی قتل کی واردات میں وہ بظاہر طور پر شامل ضرور تھا لیکن میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔ پولیس ملزم سے مزید پوچھ گچھ کر رہی ہے اور تہرے قتل کی اس واردات سے متعلق پولیس مقتولین کے رشتہ داروں سے بھی رابطہ قائم کر رہی ہے تاکہ پتہ چل سکے کہ قتل کی اصل وجہ کیا تھی۔ ملزم یہ بھی کہتا ہے کہ اگر اخبارات میں میرے اور میرے خاندان کے متعلق غلط خبریں شائع ہوئیں تو میں ان کے خلاف عدالت میں دعویٰ کروں گا۔

"یوم سیاہ" ٥

مظفر وارثی

پاکستان کے ساتھ اپنی وابستگیوں کو عام کرو
اپنا ظاہر اپنا باطن اس دھرتی کے نام کرو

کالک اور بڑھے گی ذہن کے منہ پر کالک ملنے سے
روشنیوں کے چاہنے والو چمکیلے اقدام کرو

ایک زبان اور ایک لباس
محبت اور یگانگت کو فروغ دیتے ہیں

جسٹس گل محمد خاں

FAMOUS AND POPULAR TAFSEER
(IN URDU)

تفہیم القرآن

BY ABUL A'LA MAUDUDI

SET OF SIX VOLUMES
HARDCOVER AND DELUXE QUALITY

FOR ONLY U.S. **$41.00**

(PLEASE ADD $10.00 FOR PACKING AND MAILING AND ALLOW SIX WEEKS FOR PROCESSING THE ORDER. SEND MONEY ORDER, DRAFT OR CERTIFIED CHEQUE WITH YOUR ORDER.)

A VAST VARIETY OF ISLAMIC LITERATURE IN ENGLISH AND URDU IS ALSO AVAILABLE AT REASONABLE PRICES.

Ask For Free Catalogue.

ICNA Book Service

157 MAMMOTH HALL TR.
SCARBOROUGH, ONTARIO
CANADA M1B 1P8

TEL: (416) 292-3777 (p.m.)